پہلی چھاپ .. .. ایک ہزار

قیمت .. .. دو روپے

مطبوعہ

تنظیم پریس ، لکھنؤ

جنوری ۱۹۵۰ء

پیش نامہ

روزنِ در

دیوان غالب کو ایک نئے ملبوسِ جمیل سے آراستہ کرکے شایع کرنا خوش ذوقی کی ایک دلیل ہو لیکن اُس پر تعارف، پیش لفظ یا مقدمہ کی حیثیت سے کچھ لکھنا "سرگشتگیِ خمارِ رسوم و قیود" کے دائرے میں آتا ہو۔ غالب نے "پابندگیِ رسم و رہِ عام" کی طرف جس طرح یہ انداز میں اشارہ کیا ہو اُسے یاد رکھنے والے کبھی محض تعارف کی رسم پوری کرنے کے لیے تعارف یا پیش لفظ نہیں لکھ سکتے۔ رہا کوئی تنقیدی یا ادبی مقالہ، جو مقدمے کی حیثیت سے شامل کیا جائے، اس کے لکھنے کا حق اچھے اچھے غالب شناس اَدا کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ

تنقیدی مقدمہ کا خیال آتے ہی انگریزی ادب کے کسی ناقد اور مفکر کی بات یاد آتی ہے جس نے اس سوال پر کہ شیکسپیر کے ڈرامے ہیملٹ پر سب سے اچھی تنقیدی کتاب کون سی ہے، خود ہیملٹ ہی پڑھنے کی رائے دی تھی۔ گو میں اس رائے سے پوری طرح متفق نہیں ہوں لیکن یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ دیوان غالب پڑھنے والے کو اس وقت تک کے لیے تنہا چھوڑ دینا چاہیے جب تک کہ وہ خود اس کے متعلق دوسروں کے خیالات جاننے کا خواہش مند نہ ہو۔ ان باتوں پر نظر رکھ کر عقل کا فتویٰ یہی ہے کہ اس "روے دل آرام" کو مشاطگی کی حاجت نہیں ہے۔ اگر مشاطگی ضروری ہو تو وہ اتنی ہی ہے کہ اسے صحت کے ساتھ حسین اور دل کش انداز میں شایع کیا جائے۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ تمام شعراے اُردو کے کلیات، دواوین اور مجموعۂ کلام میں دیوان غالب (اُردو) سب سے زیادہ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ سنہ ۱۸۴۱ء سے اس وقت تک اسکے نہ جانے

کتنے اچھے اور بُرے، سادہ اور پُرکار، صحیح اور غلط، گراں اور ارزاں، چھوٹے اور بڑے ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں یہ ایڈیشن اپنے ظاہری رنگ روپ ہی میں ایک دوسرے مختلف نہیں ہیں بلکہ بسا اوقات متن میں بھی فرق رکھتے ہیں اِس لیے اربابِ ذوق کی نگاہ میں ان میں سے ہر ایک کی اہمیت ہے۔ مختلف ابتدائی ایڈیشنوں کا مطالعہ کرنے والے دوسرے شواہد کی مدد سے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون سی غزل کس زمانے میں لکھی گئی یا غالبؔ نے نظرِ ثانی کرتے ہوئے کس قسم کی تبدیلیاں کیں۔ یہ مطالعہ محض محققوں کے لیے نہیں تنقید نگاروں کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس سے جہاں ایک جانب کسی حد تک مرزا غالبؔ کے کلام کو تاریخی ترتیب سے دیکھنے کا جذبہ آسودہ ہوتا ہے، وہاں دوسری جانب ان کے ذہنی اور جذباتی نشوونما کا سُراغ بھی ملتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگرچہ ان کا اُردو دیوان پہلی بار ۱۸۴۱ء میں مطبع سید الاخبار دہلی سے شایع ہوا

لیکن وہ مرتب اس وقت ہو چکا تھا جب مرزا کی عمر تقریباً
پچیس سال تھی کیونکہ رامپور، لاہور، اور بھوپال کے نسخوں سے
یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے پچیس سال کی عمر
تک "طرزِ بیدل" کی پیروی میں جو کچھ کہہ لیا تھا، اردو کی حد
تک وہی ان کے کلام کا بیشتر حصّہ تھا جس میں بہت آہستہ آہستہ
اضافہ ہوا۔ ان ابتدائی نسخوں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے
کہ فارسی سے فطری لگاؤ کے باوجود مرزا غالب شروع میں ریختہ
گوئی ہی کی جانب مائل تھے اور غالباً اردو میں رنگ بیدل کی
بہار دکھا کر ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے۔ اس
وقت تک نہ تو شیخ علی حزیں کے خندۂ زیرلبی نے انھیں ان
کی بے راہ روی سے آگاہ کیا تھا، نہ طالب آملی کے زہرنگاہ
اور عرفی کی برقِ چشم نے انھیں غلط روی پر ٹوکا تھا، نہ ظہوری
نے بازو پر تعویذ باندھا تھا، نہ نظیری نے رہنمائی کی تھی اور نہ
غالباً میر کا دیوان "گلشن کشمیر" نظر آیا تھا۔ یہ ساری باتیں دیوان

اُردو کے اُن قلمی یا طبع شدہ نسخوں سے معلوم ہو سکتی ہیں جن کا سُراغ ہمیں مفتی انوار الحق، ڈاکٹر عبد اللطیف، شیخ محمد اکرام، امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام اور دوسرے غالب شناسوں کی تحریروں سے ملتا ہے۔ پندرہ سال سے پچیس سال کی عمر تک کے کلام میں قطع و برید اور حکّ و اصلاح کے فرائض خود مرزا غالبؔ کے علاوہ اور کس کس نے انجام دیے یہ تو معلوم نہیں لیکن یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ غالبؔ کو جلد ہی اپنی مشکل پسندی کی ناکامی کا احساس ہو گیا اور انھوں نے اپنے رہنما تبدیل کر کے اور راہ بدل کر منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی۔ نسخہ حمیدیہ اور بعد کے انتخابات میں جو فرق ہے وہ اس تبدیلی مذاق کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ آج ہمیں اس بات پر تھوڑی سی حیرت ضرور ہوتی ہے کہ نگاہِ انتخاب نے بعض اچھے اشعار کیوں نظر انداز کر دیے اور بعض بے کیف یا معمولی شعر کیوں داخلِ دیوان کر لیے!

کلامِ غالبؔ کی تاریخی تدوین سے ایک اور بات جو نمایاں

ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عمر کے درمیانی حصّے میں اُنھوں نے اُردو کے بجائے فارسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنا لیا، اُردو میں بہت کم لکھا حالانکہ جو کچھ لکھا ان کے بہترین کلام میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ اُردو کی جانب وہ پھر اُس وقت متوجہ ہوئے جب اُنھیں بہادر شاہ ظفر کا قرب حاصل ہوا۔ غزلیاتِ غالب کا ایک عام مطالعہ کرنے والا ان باتوں کے دور رس اثرات سے واقف نہ ہو تو کوئی بات نہیں لیکن جو شعر کے ساتھ شاعر کو بھی سمجھنا چاہتا ہے اُسے ان اتفاقات میں معنی کی ایک دنیا پوشیدہ نظر آئے گی۔

دیوانِ غالب کے جتنے ایڈیشن اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں ان کی فہرست تو شاید ہی مرتب کی جا سکے لیکن اہم ایڈیشنوں کی نشان دہی ضرور کی جا سکتی ہے۔ ان ایڈیشنوں کے بعد جو مرزا غالب کی زندگی میں شایع ہوئے بہت دنوں تک اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی کہ دیوان کی صوری حیثیت بھی درست کی جائے اور نہ اس بات کا خیال آیا کہ غیر مطبوعہ کلام بھی متداول نسخوں میں شامل

کیا جائے لیکن بیسویں صدی میں نظامی ایڈیشن (بدایوں)، نسخۂ حمیدیہ، مرقع چغتائی، نقش چغتائی، برلن ایڈیشن، تاج ایڈیشن، طاہر ایڈیشن، دیوان غالب مرتبہ مالک رام، دیوان غالب مرتبہ عرشی رام پوری اور دیوان غالب مرتبہ علی سردار جعفری (اس وقت دونوں پریس میں ہیں) کی اشاعت کے بعد یہ شکایت نہیں کی جا سکتی کہ اردو کلام غالب کے خوب صورت ایڈیشن شایع نہیں کیے گئے ہیں پھر بھی نہ جانے کیوں یہ احساس باقی رہ جاتا ہے کہ دیوان غالب کا ایک ایسا صحیح، صاف ستھرا، خوب صورت اور سستا ایڈیشن ابھی تک شایع نہیں ہوا ہے، نگاہیں جسے ڈھونڈھتی ہیں۔ ظاہری حسن طباعت کے علاوہ یہ کوشش بھی گزشتہ پچیس تیس سال ہی کے اندر ہوئی ہے کہ غالب کے وہ اشعار بھی تلاش کر کے شایع کیے جائیں جو انھوں نے نظر انداز کر دیے تھے یا کسی اور وجہ سے دیوان کا جز نہیں بن سکے تھے۔ نسخۂ حمیدیہ کی دستیابی تو خیر ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے ماسوا بھی اردو اور فارسی نظم و نثر کے بہت سے جواہر پارے

مختلف ذرایع سے ہاتھ آئے ہیں اور اہلِ نظر کے سامنے پیش ہوتے رہے ہیں۔ بعض اُردو دیوانوں میں ان غیر مطبوعہ اشعار کے انتخاب بھی شامل کر لیے گئے ہیں بلکہ بعض اوقات تو زیادہ تحقیق کے بغیر ایسے اشعار بھی غالب سے منسوب کر دیے گئے ہیں جن کے لیے کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال عبدالباری آسی مرحوم کی مکمل شرح دیوان غالب ہے۔ جس میں مرزا غالب کی پچیس غیر مطبوعہ غزلیں شامل ہیں۔ ان غزلوں کا ظاہری انداز ضرور دھوکا دیتا ہے لیکن ان میں وہ ساحرانہ گیرائی، وہ دل میں اُتر جانے والی مانوس کیفیت نہیں ہے جو غالب کے ایک ایک شعر میں پائی جاتی ہے۔

دیوان غالب کے مختلف اور متنوع ایڈیشنوں کے ساتھ ہی ان بہت سی شرحوں کا خیال آتا ہے جو "گنجینۂ معنی کے طلسم" کو کھولنے کے لیے مرتب کی گئی ہیں۔ نظم طباطبائی، سعید، شوکت، حسرت موہانی، سہا مجددی، بیخود دہلوی، آسی، محمد باقر، جوش ملسیانی اور شہاب الدین مصطفٰے کی شرحیں شایع ہو چکی ہیں۔ کچھ غیر مطبوعہ

ہیں، کچھ چھپ رہی ہیں اور کچھ "ناکردہ گناہوں کی حسرت" کی طرح معرضِ خیال میں ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان شرحوں سے غالب فہمی میں کچھ اضافہ ہوا ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی غالب کی اصل روح کو نمایاں نہیں کیا۔ شاید میں غلطی پر ہوں اور تشریحِ اشعار کا یہ مقصد بھی نہ ہو لیکن شرحوں کی روکھی پھیکی سپاٹ عبارت کبھی کبھی اشعار کی ساری خوب صورتی، توانائی اور ایمائی نکتہ سنجی کا خون کر دیتی ہے۔

غالب فہمی کا ذکر آ گیا تو ذہن ایک بار پھر اسی نکتے کی طرف جاتا ہے کہ دیوانِ غالب سے لطف اندوز ہونے کے لیے خود دیوان ہی کے مطالعے کو کیوں نہ کافی سمجھا جائے۔ یہ اگر "لافِ تمکیں" نہیں تو "فریبِ سادہ دلی" ضرور ہے کیونکہ چاہے انفرادی طور سے اشعار کا سمجھنا اور مشکل مقامات کا حل کر لینا آسان ہو لیکن شاعر کے نہاں خانۂ دل میں اتر کر ان حقیقتوں کا بھید پانا آسان نہیں ہے جو حسنِ خیال بن کر الفاظ کے دام میں اسیر ہوئی ہیں۔ اگر یہ محض ایک شاعرانہ جھوٹ

نہیں ہے کہ جب "ناز و غمزہ" کا ذکر کرنا ہو تو "دشنہ و خنجر" اور جب "مشاہدۂ حق کی گفتگو" ہو تو "بادہ و ساغر" کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے تو ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ بہت سے الفاظ اشارہ، استعارہ یا علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہوں گے جن کی معنوی دنیا میں داخل ہونے کے لیے شاعر کے ساتھ کوہ و بیاباں، صحرا و مرغزار، زمین و آسمان، دیر و حرم، جنّت و جہنّم، محفلِ یار و کوچۂ رقیب میں جانا اور اس کے جذبات اور محسوسات کو سمجھنا ہو گا۔ صرف اسی طرح اشعار کی روح تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ عنقائے معانی کی گرفتاری کے لیے آگہی کا دام بچھانا ضروری ہے۔ اس لیے دیوانِ غالب سے معنوی اور شاعرانہ کیف حاصل کرنے کے لیے بعض اور باتوں پر نظر رکھنا مفید ہی نہیں ضروری بھی ہے۔

میں یہاں اس بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا کہ شاعر جو کچھ پیش کرتا ہے وہ اس کی انفرادیت کا مظہر ہوتا ہے یا اُس کے عہد کی کش مکش کی آئینہ داری کرتا ہے یا یہ کہ اس انفرادیت اور اجتماعیت میں رشتہ

کیا ہوتا ہے لیکن شاعر اگر محض روایتی خیالات یا سُنی سُنائی باتیں نہیں بیان کر رہا ہے تو یقیناً وہ یا تو اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کا اظہار کرے گا یا اس کا کلام خارجی زندگی اور بیرونی فضا و ماحول کا عکس ہوگا۔ دونوں حالتوں میں اس کی زندگی کے اہم ترین پہلوؤں کا علم، اس کے اور اس کے عہد کے مزاج کی واقفیت، اس کے شعور کی تشکیل کرنے والے واقعات و حادثات کا عرفان لازمی ہے۔ غالب کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز اور ان کی شخصیت میں بہت سے پیچ و خم ہیں، ان کے اندر مسلسل ایک پیکار جاری ہے، زندگی کے عام تاثرات، اُن کے ردِّ عمل کے ساتھ مل کر ایک ذہنی اور فکری کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے متنوع تجربات جذبات کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے ایک خاص طرح کی استدلالی منزل سے گزرتے ہیں ـــــ اب اگر کوئی شخص ان باتوں پر غور نہ کرے تو وہ کلامِ غالب کے تہہ در تہہ عناصر کو کس طرح سمجھ سکے گا۔ شخصیت اور شاعری میں جو رشتہ ہوتا ہے اس کا ادراک ہی ادب کے طالب علم کو معمولی

قاریوں سے مختلف بناتا ہے اور اس رشتے کے سمجھنے کے لیے غالب کا فارسی کلام، اُن کے اردو اور فارسی خطوط، اُن کی دوسری تصنیفات اور اُن کے واقعاتِ زندگی سے واقفیت ناگزیر ہے۔

میرے خیال میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا پہلا اہم تجزیہ مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں کیا جس سے بقول ڈاکٹر وحید قریشی حالی نے یادگارِ غالب میں استفادہ کیا۔ پھر خود یادگارِ غالب ہے جو اپنی بعض خامیوں کے باوجود اب بھی غالب فہمی میں معین ہوتی ہے۔ اُس وقت کے مختلف تذکروں اور دوسری کتابوں میں غالب کا جو ذکر ہے وہ ناکافی سہی لیکن اُن کی مدد سے مالک رام، غلام رسول مہر، عرشی رامپوری، شیخ محمد اکرام نے جو سوانح عمریاں مرتب کیں وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہم ہیں۔ یوں تو غالب کی زندگی اور شخصیت کے متعلق سب سے اچھا مواد خود اُن کے فارسی اُردو خطوں اور دو اوین میں ملتا ہے لیکن اُنھیں مرتب اور عالمانہ انداز میں پیش کرنا بڑی بات ہے۔ اُن کے علاوہ غالب کی زندگی اور شاعری کے متعلق جو معلومات مولوی مہیش پرشاد، قاضی عبد الودود، حمید احمد خاں،

مختار الدین، سید مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عبدالحق، اسد علی انوری اور بعض دوسرے حضرات نے یکجا کی ہیں وہ غالب کی شخصیت اور زندگی کے بہت سے تاریک گوشوں کو منور کرتی ہیں۔ پھر بھی ابھی غالب کے بچپن اور ابتدائے جوانی، ان کی تعلیم و تربیت، علمی موقف، فارسی سے شغف کی نوعیت، حیاتِ عشق وغیرہ کے متعلق تحقیق کی گنجائش ہے۔

تحقیقی کام کے مقابلے میں غالب کی شاعری پر ابھی زیادہ غور نہیں کیا گیا ہے۔ یادگارِ غالب کے بعد چونکا دینے والا مقالہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا تھا جو نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ شایع ہوا۔ اس مقالے میں پہلی دفعہ غالب کے ذہن کے اندر جھانکنے کی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے زیادہ غور و فکر کیے بغیر اُن میں وہ باتیں تلاش کیں جو خود اُن کے ذہن میں واضح نہ تھیں۔ محمد اکرام نے غالب کی شخصیت، ماحول اور شاعری کے بنیادی تعلق کو پیش نظر رکھ کر ایک متوازن تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ گزشتہ چند سالوں میں حمید احمد، ڈاکٹر زور، آل احمد سرور، آفتاب احمد،

اسلوب انصاری، ممتاز حسین، عبادت بریلوی، اختر اورینوی، اثر لکھنوی، آل احمد سرور، رشید صدیقی، شوکت سبزواری، کلیم الدین احمد، مجنوں گورکھپوری، خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور دوسرے نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں غالب کی شاعری کے نفسیاتی، جمالیاتی، سماجی، فکری اور انفرادی پہلوؤں کا جائزہ لے کر اُن کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی۔ کلام غالب کے مطالعے کے یہ متنوع انداز غالب فہمی کے لیے ایک شگونِ نیک کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اَب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ غالب کے نظریۂ فن، جمالیاتی شعور، خیال اور جذبے کے امتزاج کی نوعیت، فلسفیانہ میلان، تصوریت اور حقیقت پسندی، استعمالِ زبان، دورِ جدید کے لیے مقبولیت اور اہمیت اور بنیادی تصورات کو موضوع بنا کر تنقیدی مقالات لکھے جائیں تاکہ قومی تہذیب اور قومی اَدب میں ان کا مرتبہ واضح ہو سکے اور اگر اُن کی شاعری میں رازِ حیات کی جستجو کرنے والوں کو کوئی گہری حقیقت ملتی ہے تو ہماری زندگی سے اس کا رشتہ استوار ہو سکے۔ یہی شعر و ادب کی تہذیبی اہمیت ہے۔

غالب ایک "محشرِ خیال" کا نام ہے جس کی شخصیت رنگا رنگ ہے اور

حسین مجموعہ ہفت رنگ ہے، کبھی رنگ رکھتا ہے، ایک ہی نہیں کئی رنگ،
جن کے دیکھنے کے لیے تو ذرا اور باریک بیں آنکھوں کی ضرورت ہے۔
جنھوں نے ان رنگوں کو دیکھا ہے اُن کے احساسِ جمال اور ادراک
جذبات میں اضافہ ہوا ہے، ان کی مسرت اور شعور دونوں کی حدیں
وسیع ہوئی ہیں اور انھیں اپنے اُدب کی روایتوں سے محبت پیدا ہوئی
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن جن ہاتھوں میں پہنچے گا
وہ غالب کو اسی نظر سے دیکھیں گے۔

دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن مطبع نظامی کانپور کے تقریباً ایک
صدی پرانے اُس ایڈیشن (۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۲ء) پر مبنی ہے جس کے متعلق مہتمم طباعت
محمد عبدالرحمٰن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کی تصحیح خود جناب مصنف غالب
نے کی ہے۔ اس کی یہ خصوصیت نہ بھی ہوتی تو یہ کیا کم تھا کہ اس حسین و دل کش پیکر
میں اُردو دیوانِ غالب ہی ہے جسے پسند کرنے والوں نے وید مقدس کے
ساتھ الہامی کتاب کا درجہ دیا اور جسے مخالفوں نے ڈیڑھ جزو کا ناقص
کتابچہ قرار دے کر دیوان ہی تسلیم نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس ایڈیشن

سے "غالبیات" میں کوئی اہم اضافہ نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی اشاعت غالب کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا ایک اور ثبوت فراہم کرتی ہے۔ میری تمنا ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ "کتاب نگر ایڈیشن" مشہور اور مقبول ہو۔

سیّد احتشام حسین

لکھنؤ یونیورسٹی
۲۵ر دسمبر سنہ ۱۹۵۷ء

دیوانِ غالب

کتاب نگر ایڈیشن

غزلیات

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست — ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا ۔۔۔ دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا ۔۔۔ درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم ۔۔۔ آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری ۔۔۔ حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل ۔۔۔ خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی ۔۔۔ ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا ۔۔۔ آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ۔۔۔ آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ۔۔۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا ۔۔۔ میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ۔۔۔ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار ۔۔۔ اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پَرافشاں نکلا
بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد — کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شور اُٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا — عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا — اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں — مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اِس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی — دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سرمنزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو　　لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے　　مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے　　کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر　　مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں　　چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے　　دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ　　سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا　　قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا　　حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی   عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے   یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز   میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں   طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے   ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز   ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا   رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا   اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب — آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید — پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا — جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول — آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال — نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام — گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو — یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو — واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی　　جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا　　دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا
نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا　　تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے　　خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں　　پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں　　ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے　　کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا　　انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں　　جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال　　ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی　　در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو　　آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے　　جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ　　عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط　　تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا　　لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا　　تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا   جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے   خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن   دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

دوست غمخواری میں میری سعی فرماوینگے کیا   زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آوینگے کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک   ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماوینگے کیا
حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ   کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاوینگے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں   عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاوینگے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی   یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاوینگے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں   ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراوینگے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھاوینگے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا   اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا — کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہو — ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہو — تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہو — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دلِ ہر قطرہ ہو سازِ انا البحر — ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہو میں ضامن، ادھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ — شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں — یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

بلائے جاں ہو غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا — پھر غلط کیا ہو کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سب کو مقبول ہو دعویٰ تری یکتائی کا — روبرو کوئی بُتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں — تیرا بیمار، برا کیا ہے؟ گر اچھا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا — کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب — حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا — بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا — بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا — چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر — رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے — مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے — چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی — عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا — بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب — پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر — ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا — یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا — مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط — شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر — ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو — اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہو ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہو کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعدِ یک عمرِ وِرع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہو
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا یاں جادہ بھی فتیلہ ہو لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہو طاقتِ آشوبِ آگہی کھینچا ہو عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہو دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے — تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار — یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار غم کدہ کس کے دماغ کا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ — اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام — رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا — نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی — ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ — دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی — پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل — نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں — دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال — دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گراں باریِ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا۔ ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں — یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا — رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا — کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو — دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا | جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے | ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں | شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے | یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن | غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار | لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں | حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف! | عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے | گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز | ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے | عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے | میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار　　سبزہ بیگانہ صبا آوارہ گل نا آشنا

کوہ کن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب　　آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے　　بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلاؤں　　انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا　　ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو　　دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

سُرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے　　کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رُخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم　　تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جاں درِ ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس کیوں ہو گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب — دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن — سایۂ تاک میں ہوتی ہو ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہو — سر سے گزرے پہ بھی ہو بالِ ہما موجِ شراب

ہو یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہو اگر — موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہو طوفانِ طرب سے ہر سو — موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر روحِ نباتی ہو جگر تشنۂ ناز — دے ہو تسکیں بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہو رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر — شہپرِ رنگ سے ہو بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہو گزرگاہِ خیال — ہو تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

نشے کے پردے میں ہو محوِ تماشائے دماغ — بسکہ رکھتی ہو سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل — موجۂ سبزۂ نو خیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہو زہے موسمِ گل — رہبرِ قطرہ بہ دریا ہو خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ت

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے	جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا	خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت	پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب	لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت
علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں	مبارک مبارک سلامت سلامت

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ	یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست	دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر	کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے	صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے — کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

چشمِ ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہو — دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشار دوست

غیر یوں کرتا ہو میری پرسش اُس کے ہجر میں — بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوار دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہو اُس کی رسائی واں تلک — مجھ کو دیتا ہو پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ — سر کرے ہو وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہو اگر — ہنس کے کرتا ہو بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہاے دشمن کی شکایت کیجیے — یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہو آپ
ہو ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

ج

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہو آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہو آج

آتا ہو ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہو آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہو آج

وہم مریضِ عشق کے بیماردار ہیں اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

چ

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ بہ رنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس بہ کوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

د

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

در خورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا ‌‌ نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع ‌‌ چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ‌‌ ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی ‌‌ کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بےکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار ‌‌ نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ ‌‌ کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار ‌‌ گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ ‌‌ کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ ‌‌ کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے ‌‌ کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے ‌‌ ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہو بن تیرے گھر کی آبادی　　ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ پوچھ بیخودیِ عیش مقدمِ سیلاب　　کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبّت مگر در و دیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر　　جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن　　جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کام اُس سے آ پڑا ہو کہ جس کا جہان میں　　لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہو ہمارے وگرنہ ہم　　سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا　　چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہو ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہو دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہو بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات　　سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہو تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے — سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا — رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے — مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے — طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہو زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے بہم گر صلح کرتے پارہاے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا قیامت اک ہوائے تُند ہو خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہو گریباں پر

ہو بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہو گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہو کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند ہو تیر مقرر مگر اس کی ہو کماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے لے آئینگے بازار سے جا کر دل و جاں اور
ہر چند سبک دست ہوے بُت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہو سنگِ گراں اور
ہو خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیرِ آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عُریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں — تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا — ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ز

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر — ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز دُعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں کہ دیجے آئنۂ انتظار کو پرواز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

کیوں کر اس بُت سے رکھوں جان عزیز کا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لاف تمکیں فریب سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گل باز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

س

مژدہ ای ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہی
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہی ہی
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن ای دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہی
خود بخود پہنچے ہی گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہی ہی
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

ش

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغِ حسن سے ہوتی ہی حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

ع

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع — ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی — یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام — بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ — ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے — بہ جلوہ ریزیٔ باد و بہ پر فشانیٔ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ — شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو — نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

ف

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش — مجبور یاں تلک ہوے اے اختیار حیف
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

ک

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک — کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل — ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو — نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج — گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ — یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے — دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد — زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

گ

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ل

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف — ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا — اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو — رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار — میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے — مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بت خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم

ن

لوں دامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے — اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے — خارِ رہ کو ترے ہم مہرِ گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا — آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ — اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں — ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب — ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے — پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو — اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے — بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں — اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا — پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز — نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں
ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے — ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے — لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم — دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو — ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں — جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں
حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے — جادۂ راہِ وفا جز دم شمشیر نہیں
رنج نومیدیِ جاوید گوارا رہیو — خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے — لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رخصت بے باکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں
غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں — ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

برشکالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے کھِل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

اُلفتِ گل سے غلط ہے دعویِٰ وارستگی
سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجود ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے — کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے — کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے — ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
میں اور حظِ وصل خداساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے — ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے — جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے — جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے — جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ ترے رہ گذر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار — جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق — مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی — عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو — تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ — وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا — جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے — گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں — مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا　　دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت　　یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر　　عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا　　تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا　　بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد یاں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

ترے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہو — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر — برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم — اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہو واشد گل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہو بجانِ اسدؔ — وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں
دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں — خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہو کس لیے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے — لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ　　رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے　　کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں　　لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں　　شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر　　لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے　　ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق　　میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام　　قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں　　تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا　　بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار　　جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی　　حال آں کہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا　　لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں　　ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی　　کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں　　نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی　　شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی　　ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں
ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے　　پر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں
نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے　　جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو　　سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں
اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئنہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

(۹)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو — کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی — بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں — بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے — ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو — کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا — ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ — ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا — یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ — اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر کیا سینے میں جس نے خوں چکاں مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار — یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو — صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے — کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو
ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن — تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں — نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو
سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا — ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار — پاسِ بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ — جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو